© rasailojaraid.com

مشاهدات

محترمہ زہرہ داؤدی

یہ ہے مغربی تہذیب کی دین

مغربی تہذیب نے محبت و انسانیت کو کس طرح نچوڑ لیا ہے اور قافلۂ انسانیت کو ہوس رانی اور خود غرضی کے کس مقام پر پہنچا دیا ہے اس کا کچھ اندازہ آپ کو ذیل کے مضمون سے ہوگا۔ جو ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے نہ کہ سنی سنائی۔ لیکن مشرق ابھی تک اس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اور اسے اپنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ محترمہ زہرہ داؤدی نے خود اپنے مشاہدات لکھے ہیں۔ جسے ہم سالار ویکلی حیدرآباد کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (بہ شکریہ تعمیر حیات)

۱۹۷۹ء میں میں ٹورنٹو میں تھی۔ چونکہ امریکہ اور یورپ کے ملکوں کی سیاحت بارہا ہو چکی تھی۔ اس لئے اس بار نہ تو مجھے مقامات دیکھنے کا شوق تھا بلکہ ان کی صنعتی اور سائنسی ترقی سے دلچسپی تھی۔ ہاں وہاں کے سماجی اور معاشرتی حالات جاننے اور لوگوں کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی آرزو ضرور تھی۔ سو ایک بار تقریباً ایک سال کے قیام کے دوران میری سرگرمیوں کا مرکز وہاں کے ضعیف لوگ اور ان کی دیکھ بھال کے مختلف ادارے ہیں۔

ہمارے اس بیان پر مشکل ہی سے یہاں کے لوگوں کو یقین آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کینیڈا کے سب سے بڑے شہر ٹورنٹو میں ہزاروں ضعیف افراد جن میں زیادہ تعداد عمر رسیدہ خواتین کی ہے۔ کامل گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اس میں ان کی مرضی کو دخل نہیں بلکہ وہاں خاندان کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ جوان اولادوں نے بوڑھے ماں باپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ دنیا والوں نے انہیں ناکارہ سمجھ کر ان سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور انہیں یادوں کے ریگزار میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ مہینوں گذر جاتے ہیں اور کسی آشنا چہرہ پر ان کی نظر نہیں پڑتی۔ سوائے ایک فرد کے جو ان کا کھانا یا سودا سلف لانے پر مقرر ہے۔

ان بوڑھوں کے گھروں میں ٹیلیفون ہوتے ہوئے بھی ٹیلیفون کی گھنٹی شاذونادر ہی بجتی ہے۔ کیونکہ نہ تو عزیز و اقارب کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ ٹیلیفون ہی سے ان کی خیریت دریافت کرے اور نہ خود یہ لوگ کسی کو فون کرتے ہیں۔ کہ اب ان کا کوئی غمگسار ہی نہیں ہوتا۔ ریڈیو۔ ٹی وی اور کتابوں کے علاوہ ان کے پاس دل بہلانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ایک مشغلہ اپنے پیاروں کی یاد میں ہے۔ جن کے ساتھ ان کی زندگی کبھی "زندگی" کے مانند گذری تھی۔

میں جس اپارٹمنٹ میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اسی منزل پر ساتھ کے اپارٹمنٹ میں ایک بہت ہی ضعیف خاتون تن تنہا زندگی کے دن گن رہی تھی۔ چھڑی کی مدد سے وہ اپارٹمنٹ میں ہی اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے چل پھر لیتی تھی۔ کھانے کا سامان اور ضرورت کی دیگر چیزیں دوکان سے فون کرکے منگا لیتی۔ اب چونکہ اس کی ذات سے کسی کو فائدہ پہنچنے کی امید نہ تھی۔ اس لئے اولاد اور عزیز و اقارب سبھی اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ میں اکثر اس کے یہاں جاتی۔ یہ خاصی پڑھی لکھی خاتون تھی۔ اور نہایت اچھی کتابوں کا ذخیرہ اس کے پاس موجود تھا۔ وہ مجھے پڑھنے کے لئے کتابیں بڑے شوق بلکہ اصرار کرکے دیتی۔ تاکہ دوبارہ میں کم از کم کتابیں واپس کرنے کی غرض سے ہی اس کے پاس جاؤں اور میں اس ٹوہ میں تھی کہ ذرا بے تکلفی بڑھے تو اس سے اس کے حالات زندگی اور تن تنہا رہنے کے اسباب معلوم کروں۔

بڑی بی کو یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ ہم مشرقی لوگوں نے اب تک خاندان کے ادارے کو برقرار رکھا ہے اور یہ کہ میں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ یہاں ٹھہری ہوئی ہوں اور دونوں ہی نہ صرف میری عزت کرتے ہیں بلکہ بے پناہ محبت بھی کرتے ہیں۔ خودمختار ہوتے ہوئے بھی وہ مجھے اپنا سرپرست مانتے ہیں۔

وہ بے چاری تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کسی بھی عمر اور کسی بھی حالت میں بیٹا بہو ماں باپ کو اپنے خاندان کے افراد سمجھ کر اپنے گھر میں جگہ دے سکتے ہیں۔ یا اپنے درمیان ان کی موجودگی برداشت کر سکتے ہیں۔ اس کے کئی بیٹے بیٹیاں ہیں سب کے سب ماں کو بھول کر اپنی الگ دنیا بسائے بیٹھے تھے بہت ہوا تو کسی تہوار جیسے کرسمس کے موقعہ پر رسماً آکر مل لئے یا تحفالف دے دئے۔

ملک سے باہر جاکر میرا سب سے زیادہ کربناک مشاہدہ یہ تھا کہ وہاں کا عام انسان روزمرہ کی زندگی میں کبھی موسم کے اتار چڑھاؤ کا رونا روتا ہے کبھی صحت کی خرابی کا گلہ کرتا ہے۔ کبھی بڑھتی ہوئی بے روزگاری کا راگ الاپتا ہے کبھی روزافزوں فیشنوں کی گرانی سے بے بسی کا اظہار کرتا ہے اور کبھی کام کی نیا دنی اور نا کافی اجرت ملنے پر اس کے غم کا لاوا پھٹ پڑتا ہے۔ لیکن اس کا دھیان انسانوں کے اس دکھی انبوہ کی جانب شاذونادر ہی جاتا ہے جنہیں دنیا بھلا بیٹھی ہے جنہیں ان کی اپنی پیٹ کی اولادوں نے فراموش کر دیا ہے۔ اور یہ جو اپنی جوانی کا سنہرا دور ان لوگوں کو پروان چڑھانے میں صرف کرکے تہی دامن ہو چکے ہیں جو آج جوان ہیں توانا ہیں اور جن کے بازوؤں میں دم خم ہے۔ یہ ان دکھی انسانوں کا انبوہ ہے جو اب بوڑھے ہو کر کمزور اور لاچار ہو گئے ہیں اور جن کے چار بچے انہیں بھول کر اپنی جنت ارضی میں مگن ہیں۔

ٹورنٹو میں ایسی ہی ایک اور ضعیف خاتون مسز مارگریٹ سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات کیا ہوتی میں تو اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تلاش میں رہتی تھی کہ ایسے لوگوں سے میل جول بڑھا کر یہ پتہ کروں کہ اپنی جوانی میں متحدہ خاندان کو ختم کر کے بڑھاپے میں ان لوگوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ زیادہ دوستی بھی نہ ہوئی تھی کہ چند ہی ملاقاتوں میں اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ہمدردی کا مرہم تو ذرا سا بھایا بھی درد کی لہروں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ جو کچھ ان سے سنا من و عن بیان کر رہی ہوں۔ سوائے اس کے کہ چونکہ گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی اسے میں نے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

مسز مارگریٹ نے بتایا کہ ان کے بچے ابھی چھوٹے ہی تھے کہ شوہر کا انتقال ہو گیا۔ وہاں شوہر کے انتقال کے بعد عورتوں کے لئے ہمیشہ کی بیوگی اپنانے کا رواج نہیں ہے۔ مگر یہ معاملہ تو رسم و رواج سے زیادہ دل کا ہے۔ مسز مارگریٹ کو اپنے شوہر سے اتنی محبت اور وابستگی تھی کہ وہ کسی دوسرے کو ان کی جگہ دینے پر خود کو آمادہ نہ کر سکیں۔ پھر ان کے سامنے اپنی زندگی کو رنگین اور خوش گوار بنانے سے زیادہ اپنے ننھے بچوں کا مستقبل تھا۔ سوتیلا باپ بھلا دوسرے مرد کی اولاد کو کیوں اپنانے لگا۔

بہر حال مسز مارگریٹ نے دوسری شادی نہ کی۔ بلکہ بچوں کو پروان چڑھانے ان کی اچھی تعلیم و تربیت میں اپنی جوانی اور اس کی ساری توانائی صرف کر دی۔ اب وہ بلڈ پریشر، دل کی مریض اور اعصابی تناؤ کا شکار ہیں۔ بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ شادی شدہ اولاد کو ماں کے گھر آ کر ملاقات کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے۔ وہ بہت مشغول رہتے ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کی ناؤ جو کھینچنی ہے۔ ماں تو ان کی ناؤ کو پار لگا کر خود ڈوب چلی۔

مسز مارگریٹ کے بچوں کو یہ بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ عمر رسیدہ ماں اب تو کمزور اور بے سہارا ہو چکی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آمنا سامنا ہونے پر ماں کا دکھ دیکھتے ہی ان کا دل پسیج جائے۔ اور ضمیر شور مچانا شروع کر دے اس بے برگ و بار شجر سے اب چھاؤں ملنے کی تو امید نہیں۔ پھر کیوں اس کے پیچھے اپنے وقت اور اپنے جذبات کا زیاں کیا جائے۔ اور ماں بے چاری مسز مارگریٹ کا دل یہ سب محسوس کر کے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ کاش یہ دل کانچ کا بنا ہوتا کہ ایک ہی بار کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتا۔ پر یہ ننھا سا دھڑکتا ہوا گوشت کا لوتھڑا ٹوٹتا بھی ہے تو پھیل کر اور زیادہ دکھ مایوسیاں اور محرومیاں سمیٹنے کے لئے۔

مسز مارگریٹ کو اپنی زندگی کے اس دور میں اپنے بچوں کی ہمدردی اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ جس کی انہوں نے ساری جوانی آس لگائے رکھی تھی۔ کبھی کبھی وہ کہتی ہیں لیکن اپنے آپ سے کہتی ہیں کہ اولادوں کو یہ سننے کی تاب اور موقع کہاں کہ میرے بچو میں اب بھی تمہاری ماں ہوں۔ مجھے اس طرح نظر انداز نہ کرو۔ مجھے اس طرح نہ بھول جاؤ۔ لیکن اولاد اگر کبھی بھولے بھٹکے ملتی بھی ہے تو طنز کے تیر و نشتر کے علاوہ اس کے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

مسز مارگریٹ بڑی با ہمت اور عظیم خاتون ہیں ان کا ناطہ زندگی کی خوشیوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ وہ اب بھی جینے کی جدوجہد کئے جا رہی ہیں۔ انہیں اپنے بچوں کے جذبات اور خیالات کا علم ہے۔ لیکن ان میں شکایت نام کی کوئی چیز نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہیں اپنے آپ پر اپنی ذات پر آج بھی بھروسہ ہے۔ انہیں نہ زندہ رہنے سے ڈر لگتا ہے نہ وہ موت سے خائف ہیں۔ وہ مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز میں سوچتی ہیں۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے میں نے کتنی طویل زندگی پائی ہے اور موت کب آئے گی۔" اور مرتے دم تک گردشِ ایام کا مقابلہ کرنے کے لئے مسز مارگریٹ ذہنی طور پر بالکل تیار ہیں لیکن اپنے سارے عزم اور قوت ارادی کے باوجود مسز مارگریٹ کو ایک خوف ہمیشہ گھیرے رہتا ہے، یہ ہے انجانے مستقبل کا خوف۔ خدا جانے آئندہ ان کی صحت کیسی رہے گی۔ اور تب کیا ہو گا۔ انہیں بوڑھوں کے نرسنگ ہوم میں زندگی کے ایام گذارنے سے سخت نفرت ہے۔

مسز مارگریٹ نے اپنی زندگی کے کٹھن سے کٹھن دور میں بھی دوسروں کو سہارا دیا ہے۔ لیکن خود کبھی سہارا نہیں لیا زندگی کے سارے مسائل، سارے فرائض اپنی کوششوں سے انجام دئیے۔ لیکن آنے والے کل اب ان کے اعصاب پر سوار ہے۔ کہیں بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ وہ جسمانی طور پر ناکارہ ہو کر جینے پر مجبور نہ ہو جائے۔

۱۹۸۰ء کے نومبر میں ایک لڑکی آئرین سے ملاقات ہوئی اس کے والد بہت زیادہ عمر کے تو نہ تھے مگر پے در پے بیماریوں کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے۔ لہٰذا انہیں نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا گیا۔ جیسا کہ آئرین نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے باپ سے بے حد محبت کرتی تھی۔ لیکن چونکہ وہاں خاندانی ادارہ نام کی کوئی شے اور بزرگوں کی خدمت نام کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہ گیا۔ اس لئے اسے مجبوراً اپنے باپ کو نرسنگ ہوم میں داخل کرانا پڑا۔ آئرین کی ماں بھی زندہ ہے۔ اور تین بہن بھائی بھی ہیں کہنے کو سبھی اپنے باپ کو چاہتے ہیں مگر اتنا وقت کس کے پاس ہے۔ کہ بیمار باپ کی تیمارداری کرے۔ آئرین نے میرا ملامت آمیز رویہ دیکھ کر بتایا کہ باپ کو اس طرح نرسنگ ہوم میں پھینک دینے پر اسے احساس ندامت اور احساس جرم دونوں ہیں کہ اس باپ نے اپنے بچوں کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں اور انہیں ہر طرح کا عیش و آرام دیا ہے۔ مگر مجبوری ہے۔

آرام گاہیں یا اذیت گاہیں دیکھ بھال کے اداروں میں جو بوڑھے رہتے ہیں انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زندہ انسان کو قبر میں اتار دیا گیا ہے۔ اور مٹی ڈالنے کے لئے یا تو تابوت کا ڈھکنا بند کرنے کے لئے ان کی سانس رکنے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ یہ نرسنگ ہوم ضعیفوں کے لئے آرام گاہ سے زیادہ اذیت گاہیں ہیں ایک سماجی کارکن نے مجھے بتایا کہ نرسنگ ہوم میں زندہ انسان کو اس کی شخصیت کو اس کے وجود کے احساس سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اچھے بھلے ہوشمند افراد یہاں آ کر مخبوط الحواس ہو جاتے ہیں اور یہ بات تو اب مغرب والے بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ کوئی بھی سماجی یا سرکاری ادارہ گھر کی جگہ نہیں لے سکتا۔ گھر جس میں اپنے پیاروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں انسان کو خریدی ہوئی دیکھ بھال سے زیادہ محبت بھری توجہ کی ضرورت ہے ایسے گھر اور ایسے عزیزوں کے لئے جی ترستا ہے جو انہیں محبت اور شفقت سے رکھ سکیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک سماجی کارکن سے باتیں ہوئیں تو اس نے بتایا کہ جیتے جاگتے لوگوں کو صرف بڑھاپے کی پاداش میں ان اداروں میں چھوڑنا انتہائی غیر انسانی فعل ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ضعیفی کے جرم میں انہیں گولیوں سے اڑا دیا جائے۔

ایک اور سماجی کارکن کا کہنا تھا کہ جتنے لوگ ان بوڑھوں کے نرسنگ ہوم میں رکھے جاتے ہیں ان میں زیادہ تعداد ایسے افراد کی ہوتی ہے جو ذہنی اور دماغی صلاحیت میں کسی طرح کم تر نہیں ہوتے۔ صرف یہ کہ وہ جسمانی توانائی سے محروم ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد ماؤف ہو جاتے ہیں۔

یہ حالات دیکھ کر مغرب میں بھی اب لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کہ بوڑھے لوگوں کے لئے گھریلو ماحول کی سہولتیں کیسے مہیا کی جائیں۔ اور ہم جو مشرق کے متحدہ خاندان کی پروردہ ہوں بوڑھوں کی حالتِ زار دیکھ کر کانپ اٹھی اپنا حشر کیا ہوگا اللہ جانے۔ کہیں ضعیفی کی عمر آنے تک ہمارے ملک میں بھی بوڑھوں کے نرسنگ ہوم کھل گئے تب۔

یہ دعا تو ہم لوگ اپنے ملک میں بھی کرتے ہیں کہ یا اللہ تندرستی اور سوانگ کے ساتھ اٹھانا۔ لیکن صرف ضعیف ہونے کی پاداش میں ابھی ہمارے یہاں کے بزرگ گھر بدر نہیں کئے جاتے۔ بیٹا، بہو، پوتے پوتیوں سے اب بھی بوڑھوں کا گھر اور دل دونوں گلزار رہتے ہیں۔ مگر کل کی کسے خبر کہ اپنا ملک ترقی پذیر ملک ہے۔ اور اپنے رہن سہن اور طرزِ معاشرت کو اپنا کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لگانے کی کوشش کر رہا ہے ✣

وضو قائم رکھنے کے لئے جوتے پہننا بہت ضروری ہے ہر مسلمان کی کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کا وضو قائم رہے۔
سروس انڈسٹریز
پائیدار۔ دلکش۔ موزوں اور واجبی نرخ پر جوتے بناتی ہے
Servis
سروس شوز
قدم قدم حسین قدم قدم آرام

© rasailojaraid.com